# عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ

از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

## (۲)

## اجتہاد کی نئی تعریف اور نئے اصول

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اجتہاد کی ضرورت پر پہلے ایک لمبی بحث کی ہے۔ پھر اجتہاد کی نئی تعریف کر کے اپنے کچھ نئے اصول اجتہاد قائم کیے ہیں۔ اجتہاد کی اس نئی تعریف اور ان نئے اصولوں کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اپنی سفارشات میں کمیشن نے جو انقلابی قدم اٹھایا ہے اس کو اس وقت تک جائز اور معقول ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک اجتہاد کی نئی تعریف کر کے اس کی روشنی میں اجتہاد کے کچھ نئے اصول اختراع نہ کیے جاتے۔ ہمارا اب تک کا جتنا بھی فقہی ذخیرہ ہے وہ تمام تر اجتہاد کے ان پرانے اصولوں پر تیار ہوا ہے جو ہماری اصول فقہ کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی نئی فقہ بنانی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ پرانے اصول کام نہیں دے سکیں گے، اس کے لیے لازماً نئے اصولِ فقہ ایجاد کرنے پڑیں گے۔

میں کمیشن کی سفارشات پر بحث کرنے سے پہلے ہی جدید اصولِ فقہ کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں، کیونکہ اس کا جائزہ لیے بغیر سفارشات کی اصلی قدر و قیمت واضح نہ ہو سکے گی۔

کمیشن نے جہاں تک اجتہاد کی ضرورت پر بحث کی ہے مجھے اس ضرورت سے انکار نہیں ہے۔ اس وجہ سے میں اس پر کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔ اس سلسلہ میں مجھے اگر ارکان کمیشن سے شکایت ہے تو صرف اس بات کی ہے کہ یہ حضرات "تخلیقی ذہن" رکھنے کے مدعی ہونے کے باوجود اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کوئی تخلیقی نوعیت کا استدلال نہ پیش کر سکے۔ ایک آیت نقل کی ہے تو وہ بالکل بے محل۔ دو حدیثیں نقل کی ہیں تو وہ ضعیف۔ ایک صحیح حدیث نقل بھی کی ہے تو وہ بالکل بے موقع۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا تمام تر اعتماد صبحی محمصانی کی کتاب "فلسفۃ التشریع فی الاسلام" کے اردو ترجمے ہی پر رہا ہے۔ حالانکہ اس باب میں نہ آیات کی کمی تھی، نہ احادیث کی اور نہ نقلی اور عقلی دلائل کی۔ تاہم میں اس بحث کو زیادہ کریدنا نہیں چاہتا۔ میں خود اپنے

دلائل کی بنا پر اس بات کا قائل ہوں کہ اجتہاد کی ضرورت ہے، یہ ضرورت ہمیشہ رہی ہے اور رہتی دنیا تک رہے گی۔ البتہ ان حضرات نے اجتہاد کی جو نئی تعریف کی ہے اور اس کے جو نئے اصول قائم کئے ہیں مجھے ان سے اختلاف ہے اس وجہ سے ان پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

**اجتہاد کی تعریف اور اس کے شرائط** اجتہاد کی تعریف علامہ اقبال مرحوم کے حوالہ سے کمیشن نے یہ فرمائی ہے۔

"لفظ اجتہاد کے لغوی معنی کوشش کرنے کے ہیں۔ اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا مفہوم کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا ہے" (گزٹ آف پاکستان ص ۱۱۹۹)

اس اجتہاد کے لیے ان حضرات کے نزدیک علم دین میں کسی خاص مہارت یا عربی زبان کی کسی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کو جو کچھ علم رکھتا ہے حق حاصل ہے کہ وہ اجتہاد کرے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، اس نے پادریوں اور عوام کو الگ الگ تقسیم کر کے پادریوں کو کچھ خاص امتیازی حقوق نہیں دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک عام عورت بھی بسا اوقات خود ان سے بہتر فیصلے دیتی ہے، اگر وہ علم کے ساتھ بات کرتی ہے تو وہ اپنا ایک ایسا حق استعمال کرتی ہے جو اسلام کی رو سے اسے حاصل ہے" (گزٹ آف پاکستان ص ۱۲۰۱)

کمیشن کے نزدیک تمام ائمہ و مجتہدین کے متفق علیہ اجتہادات کے خلاف بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ عملاً کمیشن نے ایسا کیا بھی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ان ائمہ میں سے کوئی صاحب بھی معصوم نہیں تھے۔ اور یہ کہ جس طرح سائنس میں کسی دور کے تمام سائنس دانوں کا کسی بات پر اتفاق بھی اس بات کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا، اسی طرح قانون کی تاریخ میں بھی کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی امر پر اجماع اس کی صحت و صداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اور بعض معاملات میں کمیشن نے قرآن اور سنت کے اصل احکام کو بعد کے فقہا کے اجتہادات پر ترجیح دی ہے، قطع نظر اس سے کہ ان کے اتفاق یا اختلاف کا درجہ کیا ہے۔ کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی اپنے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ جس طرح سائنس میں ہے اسی طرح قانون

کی تاریخ میں بھی یہ بات ہے کہ بعض اوقات کسی خاص دور کے تمام مجتہدین کا کسی بات پر اجماع بھی اس کی صحت وصداقت کی کوئی ضمانت نہیں ہے"۔ (ص ۱۲۳۲)

اجتہاد کی بحث میں کمیشن نے اس طرح کے جواہر ریزے بکھیرے تو بہت ہیں لیکن میں طوالت سے بچنے کے لئے صرف مذکورہ بالا چند نکات ہی پر اپنی بحث کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔

اسلامی اصطلاح میں اگر اجتہاد کے معنی کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ اظہار خیال یا آزادانہ رائے قائم کرنے ہی کے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عام قانون سازی اور اسلامی اصولِ فقہ کے اجتہاد میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بس الفاظ کا فرق ہے مسلمانوں نے اپنی قانون سازی کا نام اجتہاد رکھ چھوڑا ہے۔ دوسرے اسی مفہوم کو اپنی اپنی زبانوں اور اپنی اپنی بولیوں میں کسی اور طرح تعبیر کرتے ہیں حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو امریکہ کی پارلیمنٹ جب قانون سازی کرتی ہے تو وہ بھی درحقیقت اجتہاد ہی کرتی ہے برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان جب کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں تو وہ بھی اجتہاد ہی فرماتے ہیں اور بھارت کی پارلیمنٹ کے ارکان جب کسی قانونی مسئلہ پر اظہارِ خیال فرماتے ہیں تو وہ بھی اجتہاد ہی ہوتا ہے۔ اور یہ سارے ہی اجتہاد گویا اسلامی اجتہاد ہیں کیونکہ سب آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں۔

اگر یہ حضرات یہ فرماتے کہ ان کے نزدیک اجتہاد کی تعریف یہ ہے تو ہم کو اس پر زیادہ اعتراض نہ ہوتا لیکن جب ان کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اسلامی قانون کی ایک اصطلاح ہے اور اس کا مطلب یہ ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجتہاد کا یہ مطلب کسی آیت یا کسی حدیث سے اخذ کیا گیا ہے یا کسی مجتہد اور کسی فقیہ نے یہ بیان کیا ہے علامہ اقبال نے اگر کہیں یہ بات لکھی ہے تو یہ کوئی دلیل نہیں ہوئی کیونکہ یہ اصطلاح علامہ اقبال کی نہیں ہے بلکہ فقہاء اور اصولیوں کی ہے، انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس اصطلاح کا مطلب بیان کریں اور جو مطلب وہ بیان کریں گے وہی مطلب اس کا ہر ایک کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اگر کسی کو اجتہاد کی اس تعریف سے اختلاف ہو جو فقہاء اس کی کرتے ہیں تو اس کو چاہئے کہ دلائل کے ساتھ پہلے اس کی تردید کرے اور پھر کتاب وسنت کی روشنی میں خود اپنی تعریف پیش کرے۔ لیکن جو اصطلاح ان کی ہے اس کا مطلب خود وضع کرنا اور اس کو ان کے سر چپک دینا، کوئی انصاف نہیں ہے۔

میں ہر دور کے ماہرینِ فقہ واصولِ فقہ کی کتابوں کی مراجعت کے بعد یہ عرض کرتا ہوں کہ اجتہاد کے یہ

معنی کسی نے بھی نہیں لیے ہیں۔ افسوس ہے کہ تمام مستند کتابوں کے حوالے نقل کرنے میں خواہ مخواہ کی طوالت ہو گی ورنہ میں ہر دور کی کتابوں کے حوالے یہاں پیش کر دیتا۔ تاہم عام ناظرین کے اطمینان کے لیے چند حوالے پیش کرتا ہوں۔

علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی لغوی تعریف کرنے کے بعد اس کی فنی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"اصولیوں کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے۔ اس انتہائی کوشش کے لیے جو کسی امرِ شرعی کے بارے میں یہ گمان حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شرع کے موافق ہے"

(ص ۲۱۸ ج ۴)

امام شافعی کی الموافقات میں اجتہاد کی یہ تعریف ہے:۔

"اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔ (ص ۸۹ ج ۴)

صبحی محمصانی کی کتاب "فلسفہ التشریع فی الاسلام" کمیشن کے نزدیک غالباً مستند ترین ماخذوں میں سے ہے اس وجہ سے اجتہاد کی جو تعریف اس نے کی ہے وہ بھی سن لیجئے:۔

"لغت میں اجتہاد کے معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش صرف کرنا ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے یعنی دین کے ان سرچشموں سے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے احکام استنباط کرنے کی سعی کرنا۔" (ص ۱۵۳)

دیکھئے: بات کیا تھی، اور ان حضرات نے کیا بنا دی! کجا دین کے اصلی سرچشموں سے احکام مستنبط کرنا اور کجا کسی قانونی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنا؟ کیا ان دونوں میں آسمان و زمین کا فرق نہیں ہے؟ لیکن ارکان کمیشن اگر اجتہاد کی یہ تعریف نہ کریں تو اپنی ان رفارشات کو دین کے اندر کس طرح شامل کر سکتے ہیں جو دین کے ماخذ سے اسی قدر بے نیاز ہیں جس قدر امریکی یا بھارتی مجلس قانون ساز کا آزادانہ اجتہاد۔

ارکان کمیشن نے امام مالکؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں کبھی

صحیح بات کہتا ہوں اور کبھی غلطی کر جاتا ہوں، میری رایوں کو کتاب اللہ اور سنت رسول پر جانچ لیا کرو۔ اگر ان کے موافق نہ پاؤ تو ان کو پھینک دو۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ نہ میری پیروی کرو نہ مالکؒ کی، نہ شافعیؒ کی اور نہ ثوریؒ کی بلکہ انہی سرچشموں سے احکام مستنبط کرنے کی کوشش کرو جن سے انہوں نے مستنبط کیے۔ کمیشن نے یہ اقوال یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیے ہیں کہ یہ آئمہ اپنے آپ کو معصوم نہیں سمجھتے تھے۔ بلاشبہ ان اقوال سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ لیکن کیا انہی اقوال سے یہ حقیقت بھی واضح نہیں ہوتی کہ اجتہاد آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دین کے اصلی سرچشموں سے احکام مستنبط کرنے کا نام ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو امام مالکؒ اپنے اجتہادات کو کتاب و سنت کی کسوٹی پر پرکھنے کا کیوں مشورہ دیتے اور امام احمد بن حنبلؒ یہ کیوں فرماتے کہ براہ راست دین کے سرچشموں کی طرف توجہ کرو۔ جو رائے آزادانہ قائم کی گئی ہو اس کو کتاب و سنت پر پرکھنے سے کیا حاصل؟

اب اس سلسلہ کی دوسری بات لیجئے۔ اس اجتہاد کے لیے ان حضرات کے نزدیک کسی خاص علم و قابلیت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ڈیموکریسی کی صحیح روح کو بروئے کار لانے کے لیے یہ حضرات ضروری سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اجتہاد کرے۔ اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں یہ حضرت عمرؓ کے زمانہ کی ایک خاتون کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک معاملہ میں عین منبر پر حضرت عمرؓ کو ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ نے ان کے اجتہاد کی تعریف فرمائی۔

اور اگر بدرجہ ادنیٰ اس کے لیے کسی علم کی ضرورت سمجھتے بھی ہیں تو وہ علم بہرحال قرآن، حدیث، یا عربی زبان کا علم نہیں ہے بلکہ اس کے لیے یہ اس علم کو بالکل کافی سمجھتے ہیں جس کے یہ خود حامل ہیں۔ اپنے اس استحقاق کو ثابت کرنے کے لیے ایک بات تو انہوں نے یہ پیش کی ہے کہ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے بلکہ یہاں علماء اور عوام ایک ہی سطح پر ہیں۔ اور دوسرا کارنامہ یہ انجام دیا ہے کہ جہاں جہاں کوئی ایسی حدیث نقل کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے جس میں عالم یا علماء کا لفظ آیا ہے تو اس کا ترجمہ مسلم سکالر (MUSLIM SCHOLAR) اور تعلیم یافتہ لوگ (PEOPLE WITH UNOWLEDGE) سے کیا گیا ہے تاکہ حدیث سے یہ بات جو واضح ہوتی ہے کہ اجتہاد علماء ہی کا منصب ہے، ترجمہ کے تصرف سے اس پر پردہ ڈالا

جا سکے اور عربی سے بے خبر لوگوں پر یہ دھونس جم سکے کہ خود حدیث میں بھی اجتہاد کا منصب عام تعلیم یافتہ لوگوں ہی کا بتایا گیا ہے، نہ کہ کتاب و سنت کے عالموں کا۔

اگر اجتہاد کی یہ تعریف صحیح ہے جو ان حضرات نے پیش کی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ اس کے لیے نہ کسی خاص علم کی ضرورت ہے نہ کسی خاص طرح کے سیرت و کردار کی، جو شخص بھی کچھ عقلی گدے لگا سکتا ہے اس کا یہ جمہوری حق ہے کہ وہ بے تکان اجتہاد کرے۔ لیکن اگر اجتہاد کی تعریف وہ ہے جو اس اصطلاح کے وضع کرنے والوں نے کی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کرنے والا دین میں گہری بصیرت رکھتا ہو، دین کی بنیادی چیزیں جس زبان میں ہیں اس زبان سے اس کو عالمانہ واقفیت ہو، نیز سیرت و کردار کے اعتبار سے وہ اس لائق ہو کہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں اس پر اعتماد کر سکیں۔ انہی صفات کے اشخاص کے لیے قرآن اور حدیث میں علماء کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ درحقیقت ایک صفاتی لقب ہے، کوئی خاندانی یا طبقاتی لقب نہیں ہے۔ بدقسمتی سے آج اس لقب سے ایسے بہت سارے لوگ بھی ملقب ہو گئے ہیں جو فی الحقیقت اس لقب کے اہل نہیں ہیں لیکن اس التباس کے باوجود حقیقت اپنی جگہ پر ہے۔ علم و فضل اور سیرت و کردار ایسی چیزیں نہیں ہیں جو چھپی رہیں۔ ایک صفاتی گروہ کو ایک مستقل طبقہ کی حیثیت میں رکھ کر اس کے خلاف تعصب میں مبتلا ہو جانا اور دوسروں کو بھی اس کے خلاف تعصب کے لیے اکسانا ایک سخت قسم کی تنگ نظری اور تنگ دلی ہے بلکہ اس سے ایک گہرے قسم کا احساس کہتری بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ایک منصب جو صفات کی بنا پر حاصل ہوتا ہے اور اکتساب سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ آپ اسے خود حاصل کر لیجیے، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ آپ کو اس منصب تک پہنچنے سے روک سکے۔ لیکن یہ عجیب دردناک صورت حال ہے کہ آپ کو آتا تو دین اور شریعت کا ایک حرف نہیں لیکن اس میں اجتہاد ضرور فرمائیں گے کیونکہ دین کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اگر یہ منطق صحیح مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بائی کورٹوں میں بیٹھ کر مقدمات کے فیصلے کرنا بھی صرف ماہرین قانون ہی کا حق نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر شخص کو حق ہونا چاہیے کہ وہ مقدمات کے فیصلے لکھے اور قانونی معاملات میں اپنی رائیں منوائے، علاج کرنے کا حق بھی صرف طبیبوں اور ڈاکٹروں ہی کو نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر شخص کو اجازت دے

دینی چاہیے کہ وہ لوگوں کی جانوں کے ساتھ بازی کھیل سکے۔ نہروں اور پلوں کی تعمیر بھی صرف انجنیئروں ہی کا اجارہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ جو شخص صحیح طور پر دو اینٹیں بھی جوڑ نہ سکتا ہو اسے بھی حق ہونا چاہیے کہ وہ نہروں اور پلوں کی تعمیر میں اپنی رائے دے سکے۔ اگر یہ ڈیموکریسی ہے تو یہ ڈیموکریسی دنیا کے لیے لعنت ہے اور اسلام اس ڈیموکریسی کا روادار نہیں ہے۔ اگر ایک چیز میں دخل دینے کے لیے کسی علمی و فنی قابلیت کی ضرورت ہے تو اس میں ہر شخص رائے دینے کا اہل کس طرح ہو سکتا ہے؟ اگر یہ بات صحیح ہے کہ اجتہاد کے لیے دین میں بصیرت ضروری چیز ہے تو اس شخص کے مجتہد بن کر بیٹھ جانے کے کیا معنی جسے دین سے سرے سے کوئی مس ہی نہیں؟ اسلام میں پاپائیت تو بے شک نہیں ہے لیکن آخر اسلام خدا کا دین ہے۔ کوئی بازیچہ اطفال تو نہیں ہے؟

ارکان کمیشن نے عہد فاروقی کی جن خاتون کا حوالہ دیا ہے کہ انہوں نے خود حضرت عمرؓ کو ان کے ایک اجتہاد پر ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ نے نہ صرف ان کی رائے قبول فرمائی بلکہ اس کی تحسین بھی کی، انہوں نے اس نظریہ کے تحت اپنی رائے نہیں پیش کی تھی کہ دین میں جمہوریت ہے اور یہاں علماء اور عوام میں اجتہاد کے معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے جو رائے مہر کم باندھنے کے بارے میں ظاہر کی تھی وہ ان خاتون کو قرآن کے لفظ قنطار کے واضح مفہوم کے خلاف نظر آئی۔ اس کو انہوں نے ظاہر کیا اور حضرت عمرؓ نے ان کی رائے معقول اور مبنی بر قرآن ہونے کی وجہ سے فوراً قبول کر لی۔

انہی خاتون کی طرح اسلام میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی کسی رائے پر قرآن و حدیث سے استدلال کرے اور اس کی معقولیت کی بنا پر اس رائے کو تسلیم کرا لے۔ ضرورت جس چیز کی ہے وہ قرآن و حدیث کا علم اور دین کا فہم و شعور ہے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ دین کے معاملات میں کلام کرنے کے لیے کسی خاص درسگاہ کا فاضل ہونا یا کسی مخصوص گروہ سے متعلق ہونا شرط ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی شرط نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا اتنا علم تو ہونا چاہیے جتنا ان خاتون کو تھا۔ میں نے اس رپورٹ میں ارکان کمیشن کے جو اجتہادات دیکھے ہیں اور جن کو آگے چل کر میں ناظرین کو بھی دکھاؤں گا ان کا موازنہ جب میں ان خاتون کے اجتہادات سے کرتا ہوں تو میں واضح طور پر محسوس کرتا ہوں کہ ان خاتون کا تنہا علم قرآن اس پورے کمیشن کے مجموعی علم دین سے بھی بدرجہا زیادہ تھا۔

اگرچہ اجتہاد کی صحیح تعریف سامنے آجانے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہوگئی کہ ایک مجتہد میں کیا صفتیں ہونی ضروری ہیں لیکن مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں اسلامی اصول قانون کے چند مستند ماخذوں کے حوالے بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

علامہ آمدی اپنی کتاب میں مجتہد کے لیے دو شرطیں ضروری قرار دیتے ہیں:۔

"ایک یہ کہ وہ خدا کے وجود، اس کی صفات، اس کے کمالات کو جانتا اور مانتا ہو ——— اور رسول اور اس کی لائی ہوئی شریعت اور اس کے معجزات کو تسلیم کرتا ہو۔

دوسری یہ کہ اسلامی شریعت کے احکام اور ان کے سرچشموں اور ان کے اقسام کا عالم ہو، جانتا ہو کہ ان کے اثبات کے کیا طریقے ہیں، یہ اپنے مدلولات پر کن کن طریقوں سے دلالت کرتے ہیں۔ ان کے درجات میں کیا اختلاف ہیں۔ ان میں کن شرائط کا لحاظ ضروری ہے، اگر ان میں اختلاف ہو تو ترجیح کے کیا کیا طریقے ہیں، ان سے احکام کس طرح مستنبط کیے جاتے ہیں۔ نیز ان کو لکھنے اور بیان کرنے پر قادر ہو، ان پر جو اعتراضات وارد ہوں ان سے بچ سکتا ہو۔ اس کی مزید تکمیل اس بات سے ہوئی کہ راویوں اور جرح و تعدیل کے طریقوں سے باخبر ہو..... اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ سے واقف ہو..... اور عربی زبان اور نحو کا عالم ہو۔

(الاحکام فی اصول الاحکام ج ۴ ص ۲۱۹)

امام شاطبی فرماتے ہیں:۔

"درجہ اجتہاد اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں دو صفتیں موجود ہوں۔

ایک یہ کہ وہ شریعت کے مقاصد کا پوری طرح فہم رکھتا ہو، دوسری یہ کہ وہ اس فہم کی رہنمائی میں شریعت سے مسائل استنباط کرنے پر قادر ہو" (الموافقات ج ۴ - ۱۰۶)

کمیشن کا سب سے زیادہ مستند ماخذ صبحی محمصانی اپنی کتاب فلسفۃ التشریع میں اجتہاد کے لیے حسب ذیل صفات ضروری سمجھتا ہے۔

اجتہاد کرنا ہر شخص کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ایک خاص قابلیت کی

ضرورت ہے جس سے مجتہد استدلال و استنباط کے پیش نظر مقصد کا اہل ہو سکے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ وہ پختہ فکر اور دانشمند ہو۔ اخلاق حسنہ سے متصف اور دین کے سرچشموں کا عالم ہو یعنی شرعی دلیل اور ان کے تلاش کے طریقوں اور ان کے متعلقات۔ عربی زبان، تفسیر، اسباب نزول احوال رواۃ جرح و تعدیل اور ناسخ منسوخ سے پوری طرح باخبر ہو۔" (فلسفہ التشریع ص ۱۵۵)

کیا کمیشن کے ارکان یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اجتہاد کے ان شرائط پر پورے اترتے ہیں؟

اب اس سوال کو لیجئے کہ تمام آئمہ کے متفق علیہ مسلک کے خلاف بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا ایک پہلو تو عقلی ہے اور دوسرا واقعاتی۔ جہاں تک اس کے محض عقلی پہلو کا تعلق ہے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس پہلو سے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، یہ آئمہ غلطی سے مبرا نہیں تھے اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ کسی امر اجتہادی پر سب متفق ہوں اور وہ بات صحیح نہ ہو لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو بات عقلاً محال نہ ہو وہ واقعہ کی حیثیت سے موجود بھی ہو۔ علامہ اقبال سے بڑا شاعر ہونا محال نہیں ہے لیکن اگر شخص اس دلیل کی بنا پر کہ ان سے بڑا شاعر ہونا محال نہیں ہے، میاں عبدالرشید صاحب یا خلیفہ صاحب یا ان کی شریک کار بیگمات میں سے کوئی صاحبہ یہ دعویٰ کر بیٹھیں کہ ہم ان سے بڑے شاعر ہیں تو یہ سب حضرات مجھے معاف کریں کہ میں ان کے دعویٰ کو تسلیم نہیں کروں گا کیونکہ ہمارے سامنے ان کا کوئی بھی ایسا شعری یا ادبی کارنامہ نہیں ہے جس کی بنا پر ہم ان کو شعر و ادب پر گفتگو کرنے کا بھی اہل سمجھیں چہ جائیکہ ان کو آئمہ شعر و سخن کا ہمسر مان لیں یا کچھ ان سے بھی اونچا درجہ ان کا تسلیم کر لیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ ایک مسئلہ جس پر امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے عالی مقام لوگ متفق ہیں اس کے خلاف دین کے معاملہ میں کوئی شخص خلیفہ عبدالحکیم، میاں عبدالرشید بیگم شاہنواز اور بیگم شمس النہار کے فتوے پر کوئی مسلمان کس طرح اعتماد کر سکتا ہے؟ ایک محتاط مسلمان کے لیے تو ان حضرات پر یہ اعتماد کرنا بھی مشکل ہے کہ ان میں سے کسی صاحب کو صحیح طور پر طہارت کے اسلامی آداب بھی معلوم ہیں یا نہیں کجا کہ وہ ان کی فقاہت اور ان کے اجتہاد کے پیچھے دین کے مسلمہ آئمہ کے متفقہ اجتہاد یا ان کے اجماع کو نظر انداز کر دے!

یہ نہ خیال کیجیے کہ ان آئمہ پر مسلمانوں کا یہ غیر معمولی اعتماد محض کسی اتفاق کا نتیجہ ہے، یا محض تقلید اور قدامت پرستی کا ایک مظہر ہے۔ اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے تو یہ محض ایک واہمہ ہے۔ تقلید اور

قدامت پرستی سے عوام کے ایک طبقہ کے اندر تو اشخاص یا نظریات سے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ساری دنیا اندھی نہیں ہو جاتی۔ اور اگر بالفرض ساری دنیا اندھی ہو جاتی ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ اس طرح کے عالمگیر اندھے پن کو دور کرنے کے لیے وہ روشنی بالکل ناکافی ہے جو اس کمیشن نے دکھائی ہے۔ اس سے بجائے اس کے کہ تاریکی دور ہو اندھیرے میں اور اضافہ ہو گا۔ جو لوگ اس اعتماد کو مسلمانوں کا جمود سمجھتے ہیں ان کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اس جمود کو امام ابن تیمیہؒ جیسا زلزلہ ڈال دینے والا انسان بھی ہلا نہ سکا اور شاہ ولی اللہؒ جیسے صاحب فکر اور نقاد کو بھی اس کے ساتھ سازگاری کرنی پڑی، حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو بے تکلف اور بالکل بجا طور پر علم اولین کا حامل اور وارث قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر بتایئے کہ اس کوچہ میں میاں عبدالرشید اور خلیفہ صاحب کو کون پوچھتا ہے کہ آپ کس کمیت کی مولی ہیں۔ درحقیقت ان آئمہ نے اپنے علم، اپنی بصیرت، اپنے تقویٰ، اپنی نکتہ رسی، اپنے تبحر اور دین کے لیے اپنی جانبازیوں اور قربانیوں سے اس امت پر ایک ایسی حجت قائم کر دی ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہیں گزرتا کہ ان میں سے کسی نے بھی کبھی ان کے دین کے معاملہ میں کسی سہل انگاری، کسی مداہنت یا کسی کمزوری یا دین بازی کا ارتکاب کیا ہو گا۔ آخر ان آئمہ ہدایت کے مقابل میں مسلمان ان لوگوں پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں جن کی زندگیاں یا تو دین کے ساتھ استہزا اور تلعب میں گذری ہیں یا کھلم کھلا دین بازی اور فتویٰ فروشی میں۔

ارکان کمیشن کا یہ نظریہ بھی نہایت عجیب ہے کہ جس طرح سائنس میں کسی ایک دور کے تمام سائنس دانوں کا کسی ایک نظریہ پر اتفاق اس کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا اسی طرح مذہب میں بھی کسی ایک بات پر سارے آئمہ کا اتفاق اس کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ اول تو مذہب کا سائنس پر قیاس ایک قیاس مع الفارق ہے۔ سائنس کی بنیاد قیاسات و تجربات پر ہے اور مذہب کی اساس وحی کی یقینیات پر۔ اس وجہ سے سائنس میں تو ہر وقت اس بات کا امکان ہے کہ آج آپ ایک چیز کو ثابت مانیں اور کل وہ سیارہ نکلے اور کل جس چیز کو آپ مرکز مانتے رہے ہیں آج وہ کسی دوسرے مرکز کے تابع ہو جائے۔ لیکن مذہب میں یہ غلطی اگر ہو سکتی ہے تو وحی کی یقینیات میں نہیں بلکہ حالات پر اس کے انطباق میں ہو سکتی ہے۔

..... اور وہ بھی اس دائرہ میں نہیں جس دائرہ

میں انطباق کا یہ کام خود صاحب وحی یعنی پیغمبرؐ نے انجام دے دیا ہے بلکہ صرف اس دائرہ میں ہو سکتی ہے جہاں یہ کام غیر معصوم انسانوں نے انجام دیا ہے۔ پھر ان غیر معصوم انسانوں کے بھی مختلف درجات ہیں اور انہوں نے دین کو زندگی کے حالات پر منطبق کرنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کے بھی مختلف درجے ہیں اور ان درجات کے اختلاف کے لحاظ سے مسلمانوں کا اعتماد بھی ان پر مختلف درجے کا ہے۔ مثلاً ایک انطباق تو وہ ہے جس پر خلفائے راشدین اپنے دور کے اہلِ علم و تقویٰ کے مشورہ کے بعد متفق ہو گئے ہیں۔ یہ اسلام میں اجماع کی بہترین قسم ہے اور یہ بجائے خود ایک شرعی حجت ہے۔ اسی طرح ایک انطباق وہ ہے جس پر آئمہ اربعہ متفق ہو گئے ہیں، یہ اگرچہ درجہ میں پہلی قسم کے اجماع کے برابر نہیں ہے تاہم چونکہ یہ امت من حیث الامت ان آئمہ پر متفق ہو گئی ہے اور ہر دور کے اہلِ علم و تقویٰ ان کی دینی بصیرت، ان کے تبحر، ان کے مرتبۂ اجتہاد اور ان کے تمسک بالکتاب والسنہ کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور ان کے دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش مشکل ہی سے کسی نے کی ہے اس وجہ سے ان آئمہ کے کسی اجماع کو محض اس دلیل کی بنا پر رد نہیں کیا جا سکتا کہ یہ معصوم نہیں تھے۔ یہ معصوم تو بے شک نہیں تھے، لیکن ان کے معصوم نہ ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ کسی امر پر ان کا اتفاق بھی دین میں کوئی حجت نہ بن سکے۔

میں حیران ہوں کہ میاں عبدالرشید صاحب جیسے قانون دان نے بھی سائنس اور قانون کے فرق کو سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ سائنس میں نظائر کی کوئی بھی حیثیت نہیں ہے، لیکن قانون میں، بالخصوص اس قانون میں جس کی سند میاں عبدالرشید صاحب نے حاصل کی ہے، ساری بنیاد ہی نظائر پر ہے۔ اگر اس کے اندر سے نظائر کو نکال دیجیے یا ان کو ناقابلِ اعتماد قرار دے دیجیے تو پھر کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ کیا میاں عبدالرشید صاحب، فرما سکتے ہیں کہ انگریزی قانون میں بھی اعلیٰ عدالتوں کے نظائر کی وہی حیثیت ہے جو حیثیت وہ اسلامی قانون کے نظائر کو دینا چاہتے ہیں؟

اس سلسلہ میں کمیشن نے ایک بات قابلِ لحاظ لکھی ہے۔ مسلمانوں کی تقلید اور جمود پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ عباسیوں کے دور کے خاتمہ پر جب تاتاریوں نے تمام علمی مراکز تباہ کر دیے، کتب خانے جلا دیئے اور لوگوں کے اندر آزادانہ فکر و اجتہاد کے حوصلے سرد پڑ گئے تو اسلامی قانون کو دوسرے درجہ کے

مخترعین (INNOVATORS) اور نااہلوں کی دستبرد سے بچانے کے لیے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ غلط اجتہاد کے بجائے پچھلے آئمہ کی تقلید کی جائے کیونکہ غلط اور ناقص اجتہاد سے وہ ذہنی انتشار جو پہلے ہی کچھ کم نہ تھا اور زیادہ بڑھ جاتا۔

یہ تاریخی تجزیہ اگرچہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے لیکن اگر کمیشن کے فاضل ارکان اس تجزیہ کو اور تقلید کے جواز کی اس دلیل کو کچھ وزن دیتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں وہ کونسا مبارک انقلاب آگیا کہ ارکان کمیشن اجتہاد کا دروازہ چوپٹ کھول دینے کے لیے بالکل بیتاب ہو گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بیگمات نے بھی باب اجتہاد پر یلغار کر دی ہے۔ عباسیوں کے دور کے خاتمہ پر تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر جو تباہی آئی میرے نزدیک وہ تباہی اتنی دسیع الاثر نہیں تھی جتنی وہ تباہی وسیع الاثر تھی جو سلطنت مغلیہ کے خاتمہ پر انگریزوں کے ہاتھوں نازل ہوئی۔ تاتاریوں کی لائی ہوئی تباہی سے مدرسے اور کتب خانے جتنے بھی برباد ہوئے ہوں اس سے انکار نہیں لیکن اذہان وقلوب پر انہوں نے وہ اثر نہیں ڈالا جو انگریزوں نے ڈالا۔ انگریز نے ہمارے کتب خانے جلائے تو نہیں لیکن اس نے ہمارے ذہنوں کو اس طرح مسموم کر دیا کہ ہم اپنے کتب خانوں کو ردی کے ڈھیر خیال کرنے لگے۔ اس نے ہمارے مدرسے ڈھائے تو نہیں لیکن دین اور دینی تعلیم سے اس نے ہمیں اس طرح متنفر اور بیزار کر دیا کہ ہم دینی مدرسوں میں داخل ہونے کو عار سمجھنے لگے۔ اس نے ہماری فکر و نظر کی آزادی کو بالکل سلب تو نہیں کیا لیکن ہمیں مرعوب اس طرح کر دیا کہ ہمارے لیے فکر و عمل کے ہر میدان میں وہی معیار حق بن گیا۔ پھر ایسے حالات میں کیا یہ مصلحت نہیں ہے کہ اسلامی قانون کو دوسرے نہیں بلکہ تیسرے درجہ کے مخترعین کے اجتہادات سے محفوظ رکھا جائے اور جو انتشار ذہنوں میں پہلے سے پیدا ہو چکا ہے اس کے بڑھانے کے مزید اسباب فراہم نہ کیے جائیں؟

میں پھر ایک مرتبہ اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جہاں تک اجتہاد کی ضرورت کا تعلق ہے میں اس بات کا اس سے زیادہ شدت سے قائل ہوں جتنی شدت سے اس کے قائل ارکان کمیشن ہیں لیکن آخر اہلیت و صلاحیت تو اس کے لیے ایک شرط ضروری ہے۔ ہر مدعی منصب اجتہاد کا حقدار تو نہیں بن سکتا۔ اجتہاد کی اس تعریف کے بعد کمیشن نے کچھ نئے اصول اجتہاد ایجاد کیے ہیں۔ اب ہم ان پر بحث کریں گے

**معاشرتی انصاف اور حکومت** کمیشن نے اپنے اجتہادات کے سلسلہ میں ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ "حکومت معاشرتی انصاف کی نگہبان (CUSTODIAN) ہے"

اس اصول کا ذکر اگر کسی فلسفۂ سیاست کی کتاب یا کسی حکومت کے دستور میں ایک رہنما اصول کی حیثیت سے آتا تو ہم اس سے تعرض نہ کرتے لیکن اس رپورٹ میں اس کا حوالہ جس پہلو سے آیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اس رپورٹ میں اس کا ذکر اس حیثیت سے آیا ہے کہ معاشرتی معاملات سے متعلق قانون سازی کرتے وقت حکومتِ پاکستان کو از روئے شرع کیا پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ کمیشن کا مشورہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں حکومت کو تمام قیدوں اور پابندیوں سے آزاد ہو کر قانون سازی کے لیے اقدام کرنا چاہیے۔ چنانچہ اسی نظریہ کے تحت اس رپورٹ میں ایک سے زیادہ مقامات میں حکومت کو اس بات پر اُبھارا گیا ہے کہ وہ کسی چیز کی پروا کیے بغیر کمیشن کی پیش کردہ سفارشات قبول کرے اور ان کے مطابق قانون بنا ڈالے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

"بدقسمتی سے اس وقت مسلم معاشرہ زندگی کے ایسے اہم معاملات میں (اشارہ ہے نکاح، طلاق، تعدد ازدواج وغیرہ کے ان معاملات کی طرف جن کے بارے میں کمیشن نے سفارشات پیش کی ہیں) بالکل غیر ذمہ دار ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے حکومت کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کے لیے اقدام کرے جو ان پھیلی ہوئی برائیوں کو روک سکیں" (رپورٹ آف پاکستان، ص ۱۲۲۹)۔

اس اصول سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت سوشل جسٹس کی کسٹوڈین ہوتی ہے اور ہماری حکومت بھی سوشل جسٹس کی کسٹوڈین ہے لیکن اس کے کسٹوڈین ہونے کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اس اصول کی آڑ لے کر من مانے قوانین بنانے شروع کر دے اور مذہب اور دستور، کسی چیز کی بھی پروا نہ کرے۔ ہمارے ملک کے دستور میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری، اور معاشرتی انصاف کا صرف وہی تصور جائز اور معقول تسلیم کیا گیا ہے جو اسلام نے دیا ہے چنانچہ دستور کے دیباچہ (PREAMBLE) میں یہ الفاظ ثبت ہیں۔

"جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کو جس طرح اسلام

نے ان کی تشریح کی ہے (AS ENUNCIATED BY ISLAM) پوری طرح ملحوظ رکھا جائے گا۔"

علاوہ ازیں سوشل جسٹس کا جس حد تک تعلق پرسنل لا سے ہے اس پر ایک مزید قید ہمارا دستور یہ بھی عائد کرتا ہے کہ کسی فرقہ کے پرسنل لا میں حکومت کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی۔ ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت کا اصلی منصب درحقیقت ہے بھی یہی کہ وہ دنیا میں خدا کے قانون کو جاری کرنے والی ہوتی ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی اپنی طرف سے کوئی نیا دین ایجاد کرنے کی جرأت نہیں کرتی۔ اس حقیقت کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ ہونے کے بعد اپنے پہلے ہی خطبہ میں اس طرح ظاہر فرمایا کہ "میں خدا کی شریعت کا نافذ کرنے والا ہوں اپنی جانب سے کوئی نئی چیز ایجاد کرنے والا نہیں ہوں۔"

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ قانون سازی کا یہ فارمولا کمیشن نے کس کی خاطر ایجاد فرمایا ہے۔ جہاں تک پاکستان کی حکومت کا تعلق ہے وہ تو اس اصول سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی جو ارکان کمیشن کے پیش نظر ہے اس سے اگر فائدہ اٹھا سکتی ہے تو ایک کلیت پسند ریاست (TOTALIT ARIAN STATE) فائدہ اٹھا سکتی ہے لیکن پاکستان کی ریاست ایک پابند آئین ریاست ہے جس کی قانون سازی کی آزادی پر اس کے دستور نے بہت سی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اور جب تک وہ ایک بالکل مطلق العنان حکومت بن جانے پر آمادہ نہ ہو جائے اس کے لیے ان پابندیوں کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔

صرف پاکستان ہی کی حکومت کی کیا تخصیص ہے، اس وقت تو دنیا میں کوئی حکومت بھی ایسی نہیں ہے جو سوشل جسٹس کی نگہبانی کے بہانے معاشرتی زندگی کے لیے من مانے قوانین بنانے کی جسارت کا ارتکاب کرے۔ اس قسم کی جسارت ماضی قریب میں اگر کسی حکومت نے کی ہے تو وہ روس کی اشتراکی حکومت ہے۔ اس نے عین اسی اصول کی رہنمائی میں اپنے قوانین ازدواج ۱۹۱۸ء و ۱۹۲۷ء میں اپنے ملک کے سابق معاشرتی و ازدواجی قوانین پر یک گردش قلم تلپٹ کر کے رکھ دیے تھے۔ تمام بچے ریاست کی ملکیت اور مذہب کے تحت باندھے ہوئے تمام نکاح کالعدم قرار دے دیئے گئے تھے۔ خاندان کے نظام کو سرمایہ داری کی آخری کمین گاہ ٹھیرایا گیا، طلاق دینے کے لیے میاں اور بیوی دونوں کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ جب چاہیں ایک کارڈ کے ذریعہ سے اپنے ارادۂ طلاق سے ایک دوسرے کو مطلع کر دیں۔ حرامی اور

جائز اولاد کے حقوق تقریباً یکساں کر دیئے گئے۔ ان تمام کارناموں کے لیے دلیل یہ تھی کہ حکومت سوشل جسٹس کی کسٹوڈین ہے لیکن جب اس کے نتائج سامنے آئے اور حرامی بچے فوج در فوج سڑکوں پر بالوں کتوں کی طرح پھرنے لگے اور عورتوں کی عزت کتیوں کے برابر بھی باقی نہیں رہ گئی تب سوشل جسٹس کے ان نگہبانوں کو ہوش آیا اور پھر پچھلے قوانین بحال کیے گئے۔ کیا ارکان کمیشن یہ اصول قانون سازی پیش کر کے اپنی حکومت کو بھی یہی راہ دکھانے کے خواہشمند ہیں؟

**الگ الگ دور الگ الگ احکام** کمیشن کا دوسرا اصولِ اجتہاد یہ ہے کہ "اسلامی احکام میں اس امر کو مدنظر رکھ کر فرق کیا جانا چاہیے کہ کون سے احکام سب کے لیے اور برابر قائم رہنے والے ہیں اور کون سے احکام ایک خاص طرز کی سوسائٹی، ایک مخصوص دور، اور ایک خاص علاقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں" (ملاحظہ ہو ص ۱۹۵۶)۔

مطلب اس ارشادِ گرامی کا یہ ہے کہ اسلام کے سارے ہی احکام نہ تو سب کے لیے ہیں اور نہ یہ ہر سوسائٹی، ہر دور اور ہر علاقہ کے لیے عام ہیں۔ اس کے بہت سے احکام عربوں کے لیے خاص تھے، ان کو ساری دنیا پر لاد دینا بالکل غلط ہے۔ بہت سے قوانین ایک خاص طرز کی سوسائٹی کے لیے وضع ہوئے تھے، ان کو ہر طرح کی سوسائٹی کے سر منڈھ دینا حماقت ہے۔ بہت سے احکام ایک خاص دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو اس دور کے گزر جانے کے بعد بھی گھسیٹتے چلے جانا محض دقیانوسیت اور جہالت ہے۔

اس زریں اصولِ اجتہاد کے لیے کسی قرآنی آیت یا کسی حدیث یا کسی ایسے ویسے امام و مجتہد کے قول کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے جس پر آپ کوئی حرف گیری کر سکیں بلکہ فقیہ اعظم ٹینی سن (TENNYSON) صاحب کا حوالہ دیا گیا ہے جن کا دین میں حجیت قاطع ہونا ان لوگوں کی رائے میں گویا سب کے نزدیک مسلم ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "ہر پرانا نظام نئے کے لیے جگہ خالی کر کے تبدیل ہو جاتا ہے اور خدا اپنے آپ کو بے شمار شکلوں میں ظاہر کرتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو ایک عمدہ نظام بھی دنیا کو تباہ کر کے رکھ دے"۔

اوّل تو اس ذہنیت کو ملاحظہ فرمائیے کہ جن لوگوں کو پیغمبر کے ارشادات، صحابہؓ کے اقوال اور

آئمہ کے اجتہادات میں مجالِ کلام نظر آتی ہے وہ لوگ کس اطمینان سے ایک انگریز شاعر کے ایک قول کا ایک اصول اجتہاد کے ماخذ کی حیثیت سے حوالہ دیتے ہیں۔ واقعی انسان کی جب عقل ماری جاتی ہے تو لعل و گہر کو پھینکتا اور مینگنیوں سے دامن بھرتا ہے۔

اول تو میں ان حضرات سے یہ پوچھتا ہوں کہ اگر قرآن وحدیث کے احکام اور پیغمبر کے ارشادات ہر سوسائٹی، ہر دور اور ہر علاقہ کے لیے سند اور حجت نہیں ہیں تو ٹینی سن صاحب کی بکواس ہر سوسائٹی ہر عہد اور ہر ملک و ملت کے لیے کس طرح حجت بن گئی ہے کہ آپ اس کو دلیل بنا کر سارے دین پر خطِ نسخ پھیر دینا چاہتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ ٹینی سن کا کہنا تو یہ ہے کہ ہر قدیم خواہ وہ کتنا ہی مقدس و محترم ہو اس دنیا کے لیے لعنت ہے اور ہر جدید خواہ وہ کتنی ہی بڑی لعنت ہے اس دنیا کے لیے نہ صرف رحمت اور برکت ہے بلکہ اسی کے ذریعہ سے اس دنیا میں خدا کی مرضی پوری ہوتی ہے، اگر اس کو اختیار نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس عہد کے لیے خدا نے جس نظام کو اپنا دین قرار دیا ہے ہم اس سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اس بات کو اگر اور زیادہ واضح الفاظ میں کہا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں قرآن و اسلام کا نظام قائم ہوا تھا اس زمانہ میں خدا کی مرضیات کا مظہر اسلام رہا ہو تو رہا ہو لیکن اب اس عہد میں خدا کی مرضیات کا اگر مظہر ہے تو وہی نظام ہے جو اس وقت تہذیبِ مغربی کے نام سے موجود ہے۔ آج خدا اسی لباس میں جلوہ گر ہوا ہے اور اگر اس کو اختیار نہ کیا جائے بلکہ اسلام کو اس کی جگہ لانے کی کوشش کی گئی تو یہ دنیا تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ تیسرے یہ کہ اگر آپ حضرات کا ایمان ٹینی سن پر ہے تو وہ تو قدیم میں سے کسی انتخاب کا مشورہ نہیں دیتا بلکہ پورے قدیم کو تیاگ دینے کا مشورہ دیتا ہے پھر آپ اسلام میں سے انتخاب کرنے کہاں چلے ہیں کہ اس کے جو احکام ہمہ گیر ہیں وہ تو لے لیے جائیں اور جو وقت سوسائٹی اور خاص عرب کے ساتھ مخصوص تھے وہ چھوڑ دیئے جائیں۔ اگر آپ حضرات نے ٹینی سن کو سند بنا کر اس کے مشورہ کے بھی خلاف کیا تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس طرح آپ کو اسلام کی کوئی بات تحریف کے بغیر پسند نہیں آتی اسی طرح ٹینی سن پر بھی آپ حضرات کا ایمان ادھورا ہی ہے۔ یکسو ہو کر نہ آپ حضرات امت محمدؐ میں رہنا چاہتے ہیں اور نہ امت ٹینی سن میں۔

اچھا، اب اس بحث کو چھوڑیئے کہ ٹینی سن کیا کہتا ہے۔ اب اس پر غور کیجیے کہ ارکانِ کمیشن جو کچھ فرماتے ہیں اس کی عملی شکل کیا ہوگی اور اگر ان کے زرین مشورہ پر عمل کیا جائے تو اس کے نتائج کس شکل میں ظاہر ہونگے ؟ یہ حضرات اسلام کے ان احکام میں جو سب کے لیے ہیں اور ان احکام میں جو علاقائی اور وقتی ہیں امتیاز کر کے اول الذکر کو باقی رکھنے اور موخر الذکر کو منسوخ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہم جی کڑا کر کے تھوڑی دیر کے لیے یہ مشورہ قبول کیے لیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کام کریگا کون ؟ جہاں تک خدا اور رسول کا تعلق ہے انہوں نے تو عمومی احکام اور علاقائی اور وقتی احکام میں امتیاز کرنے کے لیے کوئی کسوٹی ہمیں دی نہیں ہے بلکہ سارے دین کو ایک ہی حیثیت میں دیا ہے اور سب کے لیے دیا ہے اور قیامت تک کے لیے دیا ہے۔ جو احکام وقتی تھے وہ اپنی مدت پوری کر چکنے کے بعد منسوخ ہو گئے اور یہ کام خود اللہ اور رسول نے کر دیا۔ اب ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے کہ ہم شریعت کے احکام میں وقتی اور مستقل کی تفریق کریں اور کچھ کو باقی رکھیں اور کچھ کو منسوخ کر دیں۔ اگر خدا اور رسول کی بتائی ہوئی کوئی کسوٹی جس سے یہ کام انجام پا سکے، ارکانِ کمیشن کے علم میں ہے تو انہیں چاہیے تھا کہ وہ اپنے اس مشورہ بلکہ اس اجتہاد کے ساتھ اس کو پیش کر دیتے تاکہ کام کرنے والوں کو آسانی ہوتی۔ لیکن اگر کسی وجہ سے وہ اس رپورٹ میں اس کو پیش نہیں کر سکے ہیں تو ہماری التجا ہے کہ وہ اب بھی اس کو پیش فرما دیں تاکہ یہ کارِ عظیم بسہولت اور بلا کسی نزاع و اختلاف کے انجام پا سکے۔ ورنہ قدم قدم پر جھگڑا ہوگا۔ ایک شخص ایک حکم کو وقتی اور علاقائی قرار دیگا دوسرا اسی کو ابدی اور سب کے لیے عام بنائے گا اور اس طرح ایک ایک حکم پر علاقائی و غیر علاقائی کی جنگ برپا ہو جائے گی۔ فرض کیجیے ایک شخص حج اور قربانی کے متعلق یہ دعویٰ کر بیٹھتا ہے کہ یہ محض ایک علاقائی نوعیت کا حکم تھا، عربوں کو اپنے اب وجد کے طریقِ عبادت سے دلچسپی تھی اس وجہ سے اسلام نے اس کو اپنا لیا، ساری دنیا کے لیے اور وہ بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے اس کے عام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے اس دعوے کا کیا جواب ہوگا؟ اسی طرح ایک دوسرا اٹھتا ہے وہ کہتا ہے کہ تحصیلِ زکوٰۃ کا طریقہ ایک خاص طرز کی سوسائٹی اور ایک مخصوص طرز کے معاشی اور تمدنی ماحول میں تو ہو سکتا تھا لیکن اب جبکہ تشخیص و تحصیل محاصل کے نہایت اعلیٰ طریقے جاری ہو چکے ہیں اسی فرسودہ طریقے پر جمے رہنا بجلی کے قمقموں کے آگے مٹی کا دیا جلانے کے ہم معنی ہے۔ ایک

اور شخص کھڑا ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ اور نکاح و طلاق سے متعلق جو قوانین بنائے تھے وہ صرف ایک مخصوص طرز کی سوسائٹی ہی میں چل سکتے تھے اب تہذیب و تمدن کے اس دور میں انہی قوانین پر اصرار کرتے چلے جانا معاشرہ کو جامد بنا دینا ہے۔ کوئی صاحب اسی قسم کا سوال اسلام کے کاروباری احکام، یا زنا اور چوری کی تعزیرات یا اسلام کے اخلاقی احکام و آداب کے متعلق اٹھا دیتے ہیں کہ یہ ساری باتیں عرب کی غیر ترقی یافتہ سوسائٹی کے لیے خاص تھیں، یہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہیں تو کوئی شخص ان کا کیا بگاڑ لیگا۔ اس طرح تو خدا کا سارا دین ہی ہوا ہو جائے گا، کچھ ایک خاص قسم کی سوسائٹی کے ساتھ مخصوص ہونے کے سبب سے منسوخ ہو جائے گا، کچھ وقتی قرار دے دیا جائے گا اور کچھ علاقائی۔

ارکان کمیشن نے اپنے اس اصول اجتہاد کی تائید میں ٹینی سن کے مذکورہ بالا قول کے علاوہ غلامی سے متعلق اسلامی احکام کا حوالہ بھی دیا ہے کہ دیکھو ایک زمانہ میں یہ احکام کتنے محترم و متقدس تھے لیکن جب زمانہ کی ترقی سے سوسائٹی تبدیل ہو گئی تو یہ سارے احکام بے معنی ہو کر رہ گئے، اب نہ غلام ہیں نہ غلامی اور نہ غلامی سے متعلق اسلامی احکام۔ کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح سوسائٹی تبدیل ہو جانے کے بعد اب اگر شادی، بیاہ، طلاق و نکاح، حدود و تعزیرات اور رشوہ اور سود سے متعلق اسلام کے احکام بھی منسوخ ہو جائیں تو اس پر تعجب کیوں ہو؟

یہ مثال تو کمیشن نے دے دی لیکن اس کے ایک پہلو پر اس نے غور نہیں فرمایا کہ غلامی سے متعلق احکام جو بیکار ہوتے ہیں وہ تو اس وجہ سے ہوئے ہیں کہ غلام جن کے تحفظ کے لیے یہ قوانین ضروری تھے، اب موجود نہیں رہے ہے! اسی طرح اگر دنیا میں چوری باقی نہ رہے تو اسلام کو اس بات پر ہرگز اصرار نہیں ہو گا کہ چوری کی سزا قطع ید لازماً نافذ ہی کی جائے، یا زنا دنیا میں باقی نہ رہے تو بھی اس کی سزا کسی نہ کسی پر ضرور ہی نافذ کی جاتی رہے، یا تعدد ازدواج کی کوئی شخصی، عائلی، قومی ضرورت نہ بھی باقی رہے تو بھی تعدد ازدواج کی اجازت پر قانوناً عمل کرایا جائے۔ قوانین تو ضرورت کے لیے بنتے ہیں۔ اگر ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو اس ضرورت کے لیے اسلام نے جو قانون بنایا ہے اس کے استعمال پر اسلام کو خواہ مخواہ اصرار کیوں ہو گا؟ لیکن اگر ایک ضرورت موجود ہے اور پہلے سے کہیں بڑھ چڑھ کر موجود ہے تو محض اس دلیل

پر کہ حالات تبدیل ہو چکے ہیں وہ قانون کیوں غیر ضروری ہو جائے گا جو اس ضرورت کے لیے اسلام نے بنایا ہے؟ غلامی اگر دنیا سے ناپید ہو چکی ہے تو یہ ایک مبارک بات ہوئی اور اب کسی کو بھی اصرار نہیں ہے کہ اس سے متعلق قوانین استعمال کرنے کے لیے ضرور کچھ غلام مہیا کیے جائیں۔ لیکن یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ چوری تو موجود ہے لیکن چوری کی اسلامی سزا پر آپ لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ زنا گلی گلی میں ہو رہا ہے لیکن زنا کی سزا کے تصور سے آپ حضرات کو وحشت ہو رہی ہے۔ سود کا کاروبار گوناگوں شکلوں میں ہو رہا ہے لیکن اس کے متعلق اسلام نے جو قانون بنایا ہے وہ منسوخ ہو جانا چاہیے۔ تعدد ازدواج کی ضرورت کا ہر پہلو موجود ہے، یہاں تک کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زنا کے دروازے چوپٹ کھول دیئے گئے ہیں، مردوں اور عورتوں دونوں نے ذواتین و ذوانات کی ذلیل حیثیت اختیار کر رکھی ہے، مغرب اور مغرب زدہ سوسائٹی میں داشتاؤں کا ایک نظام قائم ہوتا چلا جا رہا ہے، لیکن تعدد ازدواج پر قدغن لگنی چاہیے کیونکہ زمانہ بدل چکا ہے۔ آخر زمانہ کس اعتبار سے بدل چکا ہے؟ کیا اس اعتبار سے کہ اسلام نے جن برائیوں کے سدباب کے لیے یہ قوانین بنائے تھے وہ برائیاں اب عرب جاہلیت کے مقابلے میں ہزار گنا بڑھ گئی ہیں یا اس اعتبار سے کہ اب وہ ناپید ہو چکی ہیں، یا اس اعتبار سے بدل گیا ہے کہ یہ ساری برائیاں اب تہذیب کے سانچہ میں ڈھل چکی ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو اسلام اس تہذیب کی خاطر اپنے قوانین منسوخ کرنے کے بجائے آپ کی اس تہذیب پر لعنت بھیجتا ہے اور اپنے پیروؤں کو حکم دیتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تعاون کرنے کے بجائے اس کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنا پورا زور استعمال کریں۔

**جو قطعی اور غیر مشروط طور پر ممنوع نہیں وہ جائز ہے** کمیشن نے اپنا ایک متفق علیہ اصولِ اجتہاد یہ بتایا ہے کہ "جو چیز قطعی اور غیر مشروط طور پر ایک واضح حکم کے ذریعہ سے ممنوع نہیں ہے وہ جائز ہے اگر افراد یا قوم کی بہبود اس کا تقاضا کر رہی ہے" (ص ۱۲۰۴)

اس اصول کو اسلامی اصولِ فقہ کا ایک بنیادی اصول بتایا گیا ہے، حالانکہ اسلامی اصول سے اس کو کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے اصول فقہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ "اشیا میں اصل شے اباحت ہے، حرمت ان پر شریعت کے حکم کے تحت وارد ہوتی ہے"۔ اب یہ وارد ہونا ایک واضح

حکم کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے، کسی نص کے اشارہ یا اقتضا کے تحت بھی ہو سکتا ہے، اور امثال و نظائر پر قیاس کے واسطے سے بھی ہو سکتا ہے کسی چیز کی حرمت یا کراہت بیان کرنے کا طریق قرآن یا حدیث میں صرف یہی نہیں ہے کہ "ہم نے فلاں چیز غیر مشروط اور قطعی طور پر حرام کر دی"۔ بلکہ اس کے بہت سے اسلوب ہیں کبھی ایک شے کا مثبت پہلو بیان کر دیا جاتا ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آتی ہے کہ اس کا ضد اسلام میں حرام ہے۔ کبھی ایک حکم خاص بیان ہوتا ہے اور سیاق کلام دلیل ہوتا ہے کہ اس طرح کی ساری چیزیں حرام ہیں۔ کہیں کسی چیز کی تحریم یا کراہت کے حکم ساتھ اس کی حرمت یا کراہت کی علت واضح کر دی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن چیزوں کے اندر یہ علت پائی جائے گی وہ ساری چیزیں حرام یا مکروہ ہیں۔

ارکان کمیشن نے جو من گھڑت اصول اجتہاد اصول فقہ کی طرف منسوب کیا ہے اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر تو اس اجتہاد کی بحث میں پڑنا لاحاصل ہی ہو گیا جس کی ضرورت ثابت کرنے پر ان حضرات نے اتنی قوت صرف فرمائی ہے۔ پھر تو ان چند چیزوں کے سوا جن کو "قطعی اور غیر مشروط طور پر کسی واضح حکم کے ذریعہ سے" حرام ٹھہرا دیا گیا ہے باقی ساری چیزیں جائز اور حلال و طیب ہو گئیں۔ اس کے بعد کسی اجتہاد و قیاس کی کھکھیڑ میں پڑنے کی ضرورت ہی کب باقی رہی۔ اور یہ "غیر مشروط" کی قید لگا دینے کے بعد تو اکثر پچھلی حرمتیں بھی ہوا ہو گئیں؛ کیونکہ بہت سی حرمتیں ایسی ہیں جن کے ساتھ کوئی نہ کوئی شرط بھی لگی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں موجودہ زمانہ کے جتنے فتنے بھی ہیں انہوں نے ایک نیا سانچہ اختیار کر لیا ہے، آپ ان میں سے ہر چیز کی نسبت یہ فرما سکتے ہیں کہ خواہ ان کی حرمت اسلام میں "واضح اور غیر مشروط طور پر" کہاں وارد ہے؟ بلکہ اس سے بڑھ کر اس اصول کے تحت آپ کے یہ سوال بھی معقول ہو جائیں گے کہ یہ کہاں "واضح اور قطعی طور پر" لکھا ہوا ہے کہ عورت قوام نہیں ہو سکتی، یا عورت خود طلاق دینے کی مجاز نہیں ہے، یا عورت مہر ادا کرنے اور نفقہ دینے کی ذمہ داری قبول کرنے مرد پر شوہرانہ اختیارات نہیں حاصل کر سکتی؟ واقعہ یہ ہے کہ ان چیزوں میں سے کسی چیز کا حرام ہونا قطعی طور پر تو قرآن یا حدیث میں کہیں بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔ یہ ساری چیزیں اگر اسلام میں ممنوع ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ اس نے جو اصول قائم کر دیئے ہیں یہ باتیں ان کے خلاف ہیں اس وجہ سے تو نہیں ہیں کہ "قطعی اور غیر مشروط طور پر واضح الفاظ میں" ان کی ممانعت وارد ہے۔ اپنے اس نادر اصول کے بعد تو یہ حضرات

اگر کل کو یہ چیلنج کر دیں کہ قطعی اور غیر مشروط طور پر کہاں واضح الفاظ میں اس بات کی ممانعت وارد ہے کہ ایک عورت بیک وقت چار مردوں سے نکاح نہیں کر سکتی تو مجھے اندیشہ ہے کہ غریب مولوی ان لوگوں کو شاید ہی کوئی مسکت جواب دے سکیں۔

**جدید اسوۂ حسنہ کی پیروی کی دعوت** کمیشن کا چوتھا اصول اجتہاد یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے معاشرتی اور اقتصادی سانچے یکسر تبدیل ہو چکے ہیں اس وجہ سے اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جس نقشے کو سامنے رکھ کر معاشرتی اور اقتصادی مسائل حل کیے گئے تھے وہ نقشہ اب کام نہیں دے سکتا۔ اب اس نئے نقشے کی پیروی کرنی چاہیے جو زمانہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:۔

"موجودہ زمانہ کا معاشرتی اور اقتصادی نقشہ ( PATTERN ) اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مقابل میں قابل لحاظ حد تک تبدیل ہو چکا ہے" (ص ۱۲۲۹)

اس حقیقت سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ موجودہ زمانہ کے اقتصادی اور معاشرتی سانچے اسلام کی ابتدائی صدیوں کے مقابل میں تبدیل ہو چکے ہیں اور یہ تبدیلی ہم سے اس بات کا مطالبہ کر رہی ہے کہ ہمیں نئے پیدا شدہ مسائل کا اسلام کی روشنی میں حل ڈھونڈھنا چاہیے۔ اگر اس تبدیلی کی خبر دینے سے کمیشن کا مقصد وقت کے اس مطالبہ کی طرف اشارہ کرنا ہے تو اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اگر کمیشن کا مطلب یہ ہے کہ ان تبدیلیوں میں سے ہر تبدیلی مستحسن ہے اور اس تبدیلی کے مطابق نہ صرف ہمیں بلکہ اسلام کو بھی تبدیل ہو جانا چاہیے تو کمیشن کے اس خیال کے ساتھ کوئی معقول آدمی اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ان میں سے بہت سی تبدیلیاں ایسی ہیں جو زمانۂ جاہلیت کی طرف رجعت کے حکم میں داخل ہیں اور ان کو نہ صرف یہ کہ ہمیں قبول نہیں کرنا ہے بلکہ اگر ہم اسلام کو جاہلیت پر غالب دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو ہمیں ان کی اصلاح کرنی ہے۔ کمیشن اگر زمانہ کی ہر تبدیلی کو مبارک سمجھتا ہے اور اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنا سب کچھ بدل لینے کا مشورہ دیتا ہے تو ہمارے نزدیک یہ مشورہ نہایت غلط ہے۔

اس اصول اجتہاد کے قائم کر لینے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر بار بار کمیشن نے یہ دعویٰ کرنے کی غلطی کیوں

کی ہے کہ ہم جو کچھ فرما رہے ہیں وہ عین کتاب وسنت کی روشنی میں فرما رہے ہیں۔ پھر تو نہ اسلام ایک دین کامل رہا اور نہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ دائمی رہا۔ اگر یہ کہا گیا تھا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (اب میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا) یا یہ فرمایا گیا تھا کہ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ٥ (تمہارے لیے رسول کے طریقہ کے اندر نمونہ ہے) تو یہ ساری باتیں وقتی اور زمانی ہوئیں۔ پیروی کے لیے اصل اسوہ تو زمانہ کا اسوہ ہوا۔ پھر کتاب وسنت کا حوالہ دینے کا تکلف کیوں کیا گیا۔ پھر تو یہی ایک فیصلہ کن بات کہنے کی تھی کہ موجودہ زمانہ کے معاشرتی اور اقتصادی سانچے اور ہیں اس لیے قرآن وحدیث کو اب بالائے طاق رکھو، یہ دقیانوسی چیزیں اب چلنے والی نہیں ہیں۔

ارکان کمیشن نے اس اصول کے بیان کرنے میں غایت اجمال سے کام لیا ہے۔ یہ واضح نہیں فرمایا کہ موجودہ زمانہ کی وہ کیا اقتصادی ومعاشرتی برکتیں اور رحمتیں ہیں جن کے ظہور میں آجانے کے بعد اب اسلام کی بساط لپیٹ دینی چاہیے؟ اس وقت کے سماجی واقتصادی نظام کی بہترین نمائندگی تو انگریز اور امریکن یا روسی کر رہے ہیں۔ آخر ان کی وہ کون سی چیز ہے جس کے اتباع اور جس کے لیے اسلام کو چھوڑنے کی ارکان کمیشن دعوت دے رہے ہیں۔ ہم تو ان دونوں ہی کے معاشرتی اور اقتصادی نظام پر یکساں لعنت بھیجتے ہیں اور ان کو دنیا کے لیے عذاب سمجھتے ہیں۔ اگر ارکان کمیشن ان کے ماسوا کوئی اور معاشرتی اور اقتصادی نظام اپنے ذہن میں رکھتے ہیں تو براہ کرم ارشاد ہو کہ وہ کیا ہے۔ کیونکہ اس رپورٹ کے اندر تو مغرب کی اندھی اور احمقانہ تقلید کے سوا ہمیں کوئی چیز بھی نظر نہیں آتی۔

نئی سنت اور نئی فقہ کی ضرورت | کمیشن کا پانچواں اصول اجتہاد یہ ہے کہ:

"انسانی روابط کے بنیادی اصول جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ تو ہمیشہ قائم رہیں گے لیکن ان کے نفاذ اور تطبیق کا طریق حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا چاہیے" (ص ۱۲۲۹)

اول تو ارکان کمیشن کو یہ متعین فرما دینا چاہیے کہ انسانی روابط کے "بنیادی اصول" ہیں کیا۔ اس رپورٹ سے تو جو کچھ واضح ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی بنیادی نہیں ہے جو ان حضرات کے نزدیک تبدیل نہ ہو سکتی ہو۔ لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہے تو اس کو واضح اور متعین ہو جانا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ اگر کوئی اصول

کو خود قرآن نے یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہؓ کے متفقہ عمل نے زندگی کے حالات پر تطبیق دے کر دکھا دیا ہو تو اس کی بابت کیا ارشاد ہے؟ اس کو باقی رہنا چاہیے یا نہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن کریم صرف چند اصولوں ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس نے اصولوں کو زندگی پر منطبق بھی کیا ہے۔ اور سنت تو نام ہی ہے زندگی کے معاملات پر قرآنی اصولوں کی تطبیق کا۔ یہی خدمت اپنے اپنے دور میں ائمہ اسلام نے انجام دی ہے۔ کیا ان سب کے بارے میں ارکانِ کمیشن کا مشورہ یہ ہے کہ ان کو یکسر نظر انداز کر کے قرآن کے اصولوں کو از سرِ نو زندگی کے حالات پر تطبیق دی جائے اور نئی سنت اور نئی فقہ مرتب کی جائے؟

**اسلام پر نظرِ ثانی کی ضرورت** | ان کا چھٹا اصول اجتہاد یہ ہے کہ:

"شادی، طلاق، ولایت، تولیت اور وراثت سے متعلق قوانین وضوابط، خاندانی تعلقات میں تحفظ و استحکام اور کمزوروں کی مدد کے نقطۂ نظر سے از سرِ نو ترتیب و اصلاح (OVER HAULLING) کے محتاج ہیں۔" (ص ۱۲۲۹)

یہ احکام و قوانین ظاہر ہے کہ صرف آئمہ اور فقہاء کے اجتہادات ہی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کا بہت سا حصہ خود قرآن میں بیان ہوا ہے، پھر ان کی تفصیلات احادیث میں مذکور ہوئی ہیں، اس کے ایک حصہ پر خلفائے راشدین کا اجماع ہے اور کچھ حصہ ہے جو فقہاء کے اجتہادات سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر یہ سب نظرِ ثانی اور جانچ پڑتال کے محتاج ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان میں سے جو بدلے ہوئے حالات کے اندر اختیار کیے جانے کے لائق ہیں وہ تو رکھ لیے جائیں اور جو ان حضرات کے خیال میں فرسودہ اور کہنہ ہو چکے ہیں وہ ترک کر کے ان کی جگہ پر نئے قوانین وضع کر لیے جائیں۔

خاندان کے استحکام و تحفظ اور کمزوروں کی ہمدردی کا جو درد ان حضرات کے اندر اٹھا ہے اس کی حقیقت آگے چل کر واضح ہو گی جب آپ کے سامنے وہ تجاویز اور سفارشات آئیں گی جو ان حضرات نے مذکورہ بالا مقصد سامنے رکھ کر مرتب کی ہیں، میں آگے ان پر تبصرہ کر کے دکھاؤں گا کہ اگر یہ سفارشیں اور تجویزیں منظور ہو جائیں تو صبح و شام میں ہمارے معاشرہ کے ایک ایک خاندان کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور ہمارے اندر بھی میاں کا بیوی کے ساتھ اور بچوں کا والدین کے ساتھ وہی رسمی اور بے روح

تعلق رہ جائے گا جو آج انگلستان اور امریکہ کے اکثر گھروں میں نظر آتا ہے اور جس پر وہاں کے سنجیدہ لوگ ماتم کر رہے ہیں۔ نیز کمزوروں کی جس ہمدردی کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی حقیقت بھی واضح کروں گا کہ ان کی تجویز کردہ اصلاحات سے، اگر وہ عمل میں آجائیں، طبقۂ نسواں کی کیا گت بنے گی؟

عہدِ طفولیت کے احکام کی ترمیم و اصلاح | ہمارے ان نئے ائمہ کا ساتواں اصولِ اجتہاد یہ ہے کہ اسلام نے بعض چیزوں کی اجازت شروع شروع میں اس لیے دی تھی کہ اس وقت انسانی سوسائٹی اپنے دورِ طفولیت میں تھی۔ اب اس دورِ کمال و ترقی میں اگر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ لوگ ان اجازتوں سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو ضروری ہے کہ ان پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن سے اس سوءِ استعمال کے نقصانات کو زیادہ سے زیادہ حد تک کم کیا جا سکے۔ ارشاد ہوتا ہے:

> "خاص قسم کی معاشرتی بیماریاں خاص قسم کے علاج کی محتاج ہوتی ہیں۔ اگر اسلام نے ایک چیز کا حکم نہیں بلکہ صرف اس کی اجازت اس لیے دی تھی کہ انسانی سوسائٹی ہنوز اپنے دورِ طفولیت میں تھی اور یہ اجازت غلط طور پر استعمال ہو رہی ہے تو اس اجازت پر مزید پابندیاں اور شرطیں عائد کی جا سکتی ہیں تاکہ موجودہ خرابیوں کو ممکن حد تک کم کیا جا سکے" (ص ۱۲۲۹)

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ اسلام کی اجازتیں ہوں یا احکام یہ سب فطرت پر مبنی ہیں، فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیھا۔ اور انسان کی فطرت ہر دور، ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایک ہی رہنی چاہیے۔ اس وجہ سے اسلام کے احکام ہر ملک اور ہر زمانے کے لیے یکساں طور پر انسان کی فطرت کے مطابق ہیں۔ جو چیزیں زمانہ اور آب و ہوا سے متاثر ہوا کرتی ہیں ان کے بارے میں اسلام نے کوئی حکم ہی نہیں دیا ہے تاکہ لوگ اپنے اپنے حالات کے تحت ان میں جو روش پسند کریں اختیار کر سکیں۔ لیکن ہمارے یہ نئے ائمہ ہمیں یہ خبر دیتے ہیں کہ اسلام کے احکام میں ایسے احکام بھی ہیں جو محض انسانی سوسائٹی کے دورِ طفولیت کے تقاضوں کے تحت دیئے گئے تھے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور ان حضرات کا یہ فرمانا بھی صحیح ہے کہ اس طرح کے احکام یا اجازتوں میں اس دورِ ترقی و کمال میں ترمیم و اصلاح ہو جانی چاہیے تو گزارش یہ ہے کہ صرف ترمیم و اصلاح یا مزید پابندیوں کے اضافہ ہی پر کیوں

اکتفا کیجیے، اس طرح کے احکام اور اجازتوں کو سرے سے ختم ہی کیوں نہ کر دیجیے؟ آخر بچپنے کے اس لنگوٹ کو اس شباب کے زمانہ میں پہننے رہنا کہاں کی دانائی ہے؟ اس میں پیوند لگا لگا کر اور کھینچ تان کر کہاں تک اس لنگوٹی کو اپنے جسم پر راست لانے کی کوشش کریں گے؟ فرض کیجیے کچھ دنوں تک آپ اس سے اپنی ستر ڈھانکنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو اس سے کیا بنتا ہے، آخر ایک نہ ایک دن تو یہ آپ کو اتار کر نیا جامہ زیب تن کرنا ہی پڑے گا؟ پھر جو کام بہت سی ذلتوں اور رسوائیوں کے بعد کل آپ کو کرنا ہی ہے تو آج ہی اس سے کیوں نہ فارغ ہو جائیے؟

پھر اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر اسلام کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا جبکہ انسانی سوسائٹی اپنے دورِ طفولیت میں تھی اور اس سبب سے اس نے بعض "طفلانہ" احکام دے دیئے تو آخر بعض ہی احکام کیوں طفلانہ دیئے؟ عقل و حکمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ سارے ہی احکام سوسائٹی کے سن و سال اور اس کے عقلی معیار کے مطابق دیئے گئے ہوں۔ بچوں کو تو کوئی سبق بھی ایسا نہیں پڑھایا جاتا جو بوڑھوں کے لیے موزوں ہو۔ ان کو تو سارے ہی سبق وہی پڑھائے جاتے ہیں جو ان کے ذہن اور ان کی استعداد کے مطابق ہوں۔ اس دلیل کو بنیاد بنا کر اگر ایک شخص یہ کہے کہ پورا اسلام انسانی سوسائٹی کے عہد طفولیت کا دین ہے اور اس تہذیب و ترقی کے زمانہ میں اس کی کوئی چیز بھی اختیار کیے جانے کے لائق نہیں ہے تو آپ/ اندر ترمیم کر لینے کے بعد اس کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے؟ پھر تو روزہ اور نماز سے لے کر حدود و تعزیرات اور بیوع و معاملات تک سب اس کی زد میں آجائیں گے اور ایک ایک چیز کے متعلق بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکے گا کہ اسلام نے سوسائٹی کے ابتدائی اسٹیج میں یہ حکم دے دیا تھا اب اس میں ترمیم و اصلاح ضروری ہے۔ کیا ارکان کمیشن اپنے اس اصول اجتہاد سے اسی فتنہ کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں؟

اس اصول کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ العیاذ باللہ خدا نے اپنے آخری نبی کو بالکل قبل از وقت بھیج دیا جب کہ وہ اس دنیا کو کسی ایسے دین کی تعلیم نہیں دے سکتے تھے جو رہتی دنیا تک قائم رہ سکے اس لیے یا تو ایک خاتم الانبیاء اب اس دورِ کمال و ترقی میں آئے یا کم از کم نبوت کا سلسلہ (خواہ وہ ظلی ہو یا بروزی) قائم و دائم رہے۔ کیا ارکان کمیشن اپنے قیمتی اجتہاد کے اس قیمتی نتیجہ کو تسلیم کرتے ہیں؟

یہ فقاہت بھی قابلِ داد ہے کہ اگر لوگ کسی حکم یا کسی اجازت کی شرطیں پوری نہیں کر رہے ہیں تو ان پر مزید شرطیں عائد کر دی جائیں۔ ایک طرف تو یہ حضرات پرانے فقہاء پر یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ انہوں نے دین کو اصر و اغلال کا ایک مجموعہ بنا دیا ہے۔ دوسری طرف خود اپنا رویہ یہ ہے کہ لوگ چونکہ چار شرطیں پوری نہیں کر رہے تھے اس وجہ سے انہوں نے چار کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ اگر ان مزید چار کے اضافے کے بعد بھی وہی الجھن باقی رہے تو پھر کیا ہو گا؟ کیا مزید شرطوں کا اضافہ ہو گا یا سرے سے اجازت ہی منسوخ کر دی جائے گی۔ آخر ان دانشوروں نے اس پہلو پر کبھی کیوں نہیں غور فرمایا کہ جب انسانی سوسائٹی اپنے "دورِ طفولیت" میں تھی تو اسلامی حکومت نے کس طرح لوگوں سے یہ شرطیں پوری کرائیں؟ کیا زمانہ کی ترقی اور اس کے کمال کی یہی دلیل ہے کہ عہدِ طفولیت کی حکومت تو لوگوں کو آزادی دے کر بھی حدود کی پابند رکھ سکتی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ان حدود سے آگے پیچھے ہو سکے لیکن دورِ کمال میں جب تک انسان کے جوڑ جوڑ کو باندھ نہ لیا جائے اس وقت تک اس سے دو بیویوں کے درمیان عدل بھی نہیں کرایا جا سکتا؟ اگر اس دورِ کمال کی یہی برکتیں ہیں تو خدا ان لوگوں کی عقلوں پہ رحم فرمائے جو اسلام کے عہدِ اول کی سوسائٹی کو تو عہدِ طفولیت کی سوسائٹی کہتے ہیں اور اپنی سوسائٹی کو دورِ شباب کی سوسائٹی سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو اس شباب سے وہ بچپن ہی اچھا ہے جب انسان میں اتنا ہوش گوش تھا کہ آزاد رہ کر بھی وہ حدود کی پابندی کرتا تھا۔ ہم انسانیت کے گل سر سبد انہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جنہوں نے انسان کی اتنی اعلیٰ تربیت کا انتظام کیا نہ کہ ان حضرات کو جو پیدا تو ہوئے ہیں عہدِ کمال و ترقی میں لیکن حرکتیں وہ کرتے ہیں جن پر بچوں کو بھی شرم آئے۔

**استحسان** آٹھواں اصولِ اجتہاد جس پر ان حضرات نے اعتماد فرمایا ہے وہ استحسان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ استحسان کے اصول کو فقہائے حنفیہ مانتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو ان حضرات نے اس کا سمجھا ہے۔ یہ حضرات تو اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ عوام کے مفاد کو سامنے رکھ کر جو جی میں آئے قانون بنا ڈالے جائیں۔ یہ استحسان ہو گا اور یہی فقہائے حنفیہ کے نزدیک ایک نہایت معتبر اصولِ اجتہاد ہے جس سے ماضی میں بے شمار قانونی مشکلیں حل کی گئی ہیں۔" لیکن میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ استحسان کے متعلق یہ امر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جس دائرہ میں کتاب و سنت

یا اجماع کی کوئی رہنمائی موجود ہے وہاں اس کا کوئی کام نہیں ہے، وہاں جو کچھ کتاب وسنت یا اجماع سے ثابت ہے وہی اصل ہے۔ اگر حنفیہ اس اصول کو کوئی اہمیت دیتے ہیں تو اس دائرہ میں دیتے ہیں جس دائرہ میں سارا مدار بحث قیاس یا عرف و مصلحت پر ہے۔ اس دائرہ میں بعض مرتبہ ایک خاص صورت حال یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک بات قیاس کی رو سے تو قوی معلوم ہوتی ہے لیکن مصلحت اور ضرورت کا تقاضا کچھ اور ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں حنفیہ کا ایک گروہ اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ قیاس کو چھوڑ کر مصلحت کو اختیار کر لیا جائے اور اس کو وہ استحسان کہتے ہیں۔

امام شافعی اس استحسان کے بڑے مخالف ہیں۔ وہ اس کو ایک مستقل تشریع قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا حق اللہ اور رسول کے سوا کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر استحسان کا یہ مفہوم سمجھا جائے کہ محض مصلحت اور مفاد کو سامنے رکھ کر جس کے جو جی میں آئے قانون بنا ڈالے، جیسا کہ ارکان کمیشن کہتے ہیں، یا ایک صحیح قیاس پر بھی محض مفاد کو ترجیح دے دی جائے تو یہ ایک مستقل تشریع ہوگی جس کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام میں مصلحت یا ضرورت کا ایک خاص دائرہ ہے جس میں اسلام نے سرے سے دخل ہی نہیں دیا ہے۔ اس دائرہ میں مصلحت اور ضرورت ہی ہمارے رہنما ہیں اس وجہ سے اس میں ہم انفرادی یا اجتماعی طور پر مصالح اور حالات کی رعایت کے ساتھ جو کچھ کریں گے اگر وہ دین اور اخلاق کے کسی اصول کے منافی نہیں ہے تو وہی حق ہے اور اسی میں خدا کی رضا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حنفیہ اسی دائرہ میں استحسان کے قائل ہیں اور اسی کو مالکیہ مصالح مرسلہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

## کمیشن کی سفارشات

کمیشن کی سفارشات جن عقاید و نظریات اور اجتہاد کے جن اصولوں پر مبنی ہیں، پچھلی دو فصلوں میں ان پر تفصیل کے ساتھ بحث کر چکا ہوں۔ اب میں اصل سفارشات پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔

سفارشات پر تبصرہ کرنے میں عموماً دو باتیں میں پیش نظر رکھوں گا۔ ایک یہ کہ کمیشن نے ہر سفارش کی تائید میں جو دلائل دیئے ہیں ان پر تنقید کر کے ان کی حقیقت واضح کر دوں کہ یہ کچھ وزن رکھتے ہیں یا نہیں؟

دوسری یہ کہ ہمارے معاشرہ کو عموماً اور طبقۂ نسواں کو خصوصاً ان سفارشات سے جو نقصانات پہنچیں گے ان کو واضح کر دوں تاکہ جو حضرات اس رپورٹ کو آسمانی برکت سمجھ رہے ہیں اور جو بیگمات اس کو جلدی سے جلدی قانون کی شکل دے دینے کے لیے مطالبہ کر رہی ہیں وہ اس کے نتائج پر اچھی طرح غور کریں۔

**نکاح کی رجسٹری** کمیشن نے سفارش کی ہے کہ از روئے قانون ہر نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دے دی جائے۔ رجسٹری کا طریقہ کمیشن نے اپنے نزدیک آسان سمجھ کر یہ تجویز کیا ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک معیاری نکاح نامہ مرتب کرا کے شائع کرا دیا جائے۔ یہ نکاح نامہ ہر ڈاک خانہ سے معمولی قیمت (آٹھ آنے) پر مل سکے۔ یہ سہ ورقی ہو۔ نکاح کے وقت نکاح خواں اور گواہوں کی موجودگی میں اس کی خانہ پری کر کے اس کی ایک کاپی دولھا کے حوالہ کر دی جائے، دوسری کاپی دولہن یا اس کے ولی کو دے دی جائے اور تیسری کاپی نکاح خواں جوابی رجسٹری کے ذریعہ سے حلقہ کے تحصیلدار کے پاس بھیج دے۔ تحصیلدار کے پاس ایک مخصوص رجسٹر ہوگا جس میں ان تمام نکاح ناموں کی نقلیں محفوظ رہیں گی۔ نکاح نامہ کی ایک نقل تحصیلدار کو بھیجنا نکاح خواں کا کام ہوگا۔ اگر وہ اس کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کو پانچسو روپے جرمانہ تک کی سزا دی جا سکے گی۔

کمیشن نے نکاح کی رجسٹری لازمی کرنے کے حق میں جو دلیلیں دی ہیں اب ان کا جائزہ لیجیے۔

پہلی دلیل ——— جو ایک شرعی دلیل کی حیثیت سے لائی گئی ہے۔ یہ ہے کہ قرآن مجید میں مالی لین دین کے سلسلہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (اگر تم کوئی مالی لین دین ایک مدت معینہ تک کے لیے کرو تو اس کو لکھ لیا کرو)۔ کمیشن نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ جب مالی لین دین کے معاملہ میں تحریر کا حکم دیا گیا ہے تو نکاح کا معاملہ تو مالی لین دین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے؛ نیز اس میں "دین مہر" کی شمولیت بھی ہے جس کے بعد تو اس کے ایک واقعی مالی معاملہ ہونے میں بھی کوئی شک نہیں رہ جاتا پھر اس میں تحریر کیوں نہ ضروری قرار دے دی جائے؛

اگرچہ کمیشن کے اس استدلال پر یہ سوال پہلی نظر ہی میں سامنے آجاتا ہے کہ جب مالی لین دین کے معاملات میں اللہ تعالیٰ نے تحریر کا حکم دیا ہے تو کمیشن کے بقول جو معاملہ اس سے زیادہ اہمیت رکھنے والا ہے آخر

اس میں بھی خود اللہ تعالیٰ ہی نے تحریر کا حکم کیوں نہ دے دیا؟ کیا کمیشن کی رائے میں اللہ میاں سے یہ چوک ہوگئی؟ لیکن میں اس سوال کو نہیں چھیڑنا چاہتا۔ اگر کمیشن کا استدلال اس آیت سے صرف اس حد تک ہوتا کہ مالی دین کی طرح نکاح سے متعلق ضروری کارروائیوں کا بھی قیدِ تحریر میں آجانا ایک مستحسن فعل ہے، تو خواہ یہ استدلال صحیح ہوتا یا غلط، مجھے تحریر کو مستحسن مان لینے میں تامل نہ ہوتا۔ لیکن وہ اس آیت پر بنا رکھتے ہوئے نکاح کی رجسٹری کو لازم قرار دیتا ہے، رجسٹری نہ کرنے کو جرم مستلزم سزا ٹھہراتا ہے، اور اس کا منشا یہ بھی ہے کہ جس نکاح کی رجسٹری نہ ہو اس کے وقوع کی دوسری شہادتیں موجود ہونے کے باوجود عدالتیں اس کو جائز تسلیم نہ کریں۔ حالانکہ اس آیت میں خود مالی دین کے لیے بھی، جس سے یہ براہِ راست متعلق ہے، تحریر کو لازم نہیں کیا گیا ہے، نہ عدم تحریر کو مستلزم سزا ٹھیرایا گیا ہے، اور نہ یہی فیصلہ کیا گیا ہے کہ جس قرض کی لکھا پڑھی نہ ہو وہ سرے سے قرض تسلیم ہی نہ کیا جائے گا۔ آیت کا اصل حکم تو زیادہ سے زیادہ بس اسی حد تک جاتا ہے کہ مالی معاملات کا تحریر میں آجانا اچھا ہے تاکہ شہادت قائم ہونے میں آسانی ہو اور شک کی گنجائش نہ رہے۔ اس پر قیاس کرکے کمیشن بس اتنی ہی سفارش نکاح کے معاملہ میں بھی کرسکتا تھا، اور اگر وہ ایسا کرتا تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، بلکہ میں خود اس کو مختلف پہلوؤں سے مفید چیز سمجھتا ہوں۔ اعتراض اگر ہے تو نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دینے پر ہے۔ اس چیز کا ثبوت مذکورۂ بالا آیت سے مہیا نہیں ہوتا کیونکہ مذکورہ آیت میں جس تحریر کا حکم ہے وہ خود ہی لازمی نہیں ہے تو اس پر قیاس کرکے آپ نے جو حکم نکالا ہے وہ کیسے لازمی ہو جائے گا؟

"دینِ مہر" کے لفظ سے جو نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ نکتہ بھی محض ایک نکتۂ بارد ہے۔ مہر کے لیے "دینِ مہر" کی اصطلاح تو ہماری اور آپ کی ہے، قرآن یا حدیث میں تو یہ اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوئی ہے۔ ان میں یا تو مہر کا لفظ استعمال ہوا ہے یا اسی کے ہم معنی کوئی اور لفظ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو قرآن یا حدیث میں مہر کے متعلق دَین ہونے کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ میں تو مہر کے متعلق عام قاعدہ یہ تھا کہ جو مہر معین ہوتا تھا وہ عموماً نکاح کے وقت ہی یا اس کے معاً بعد ادا کردیا جاتا تھا۔ اگر اس طریقہ کو آج رواج دیا جائے تو اس سے ہزاروں بکھیڑوں سے چھٹی مل سکتی ہے لیکن ہماری